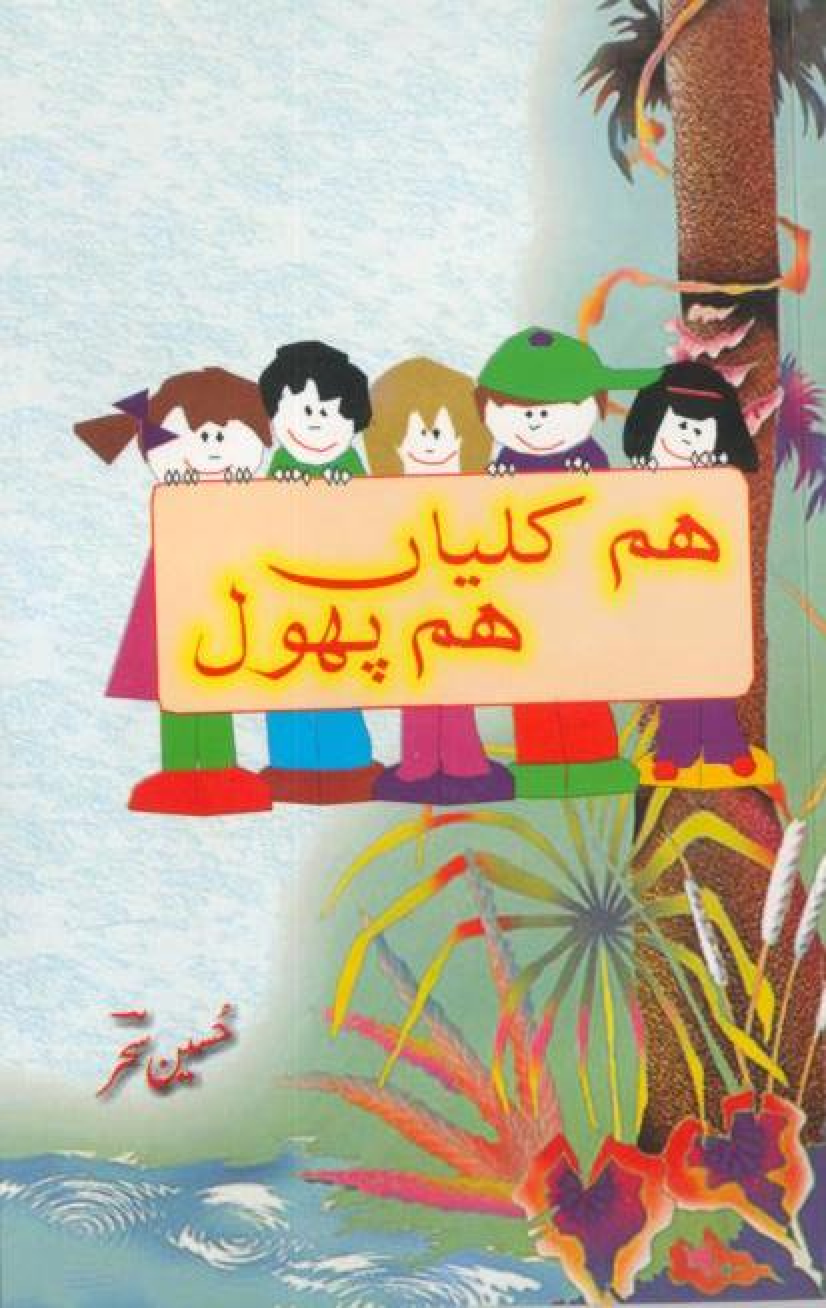

ہم کلیاں
ہم پھول
حسین سحر

ہم کلیاں ہم پھول

بچوں کے لیے
کہانیاں، ڈرامے، نظمیں، گیت

حُسین سحر

کتاب نگر
حسن آرکیڈ - ملتان چھاؤنی

ضابطہ

اشاعت اول	2001ء
کمپوزنگ	کمپوگرافکس، ملتان
طباعت	ملتان آرٹ پریس ملتان
ناشر	کتاب نگر ملتان
قیمت	پچاس روپے

یہ سب تحریریں پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن، ملتان سے نشر ہو چکی ہیں۔ لہٰذا کارپوریشن کے شکریے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہیں۔

شوذب، رمیشہ،
شہروز اور مہروز کے نام

غریب طالب علم

ایران کے شہر طوس میں ایک غریب لڑکا رہتا تھا۔ اسے علم حاصل کرنے کے بے حد شوق تھا۔ چنانچہ اپنے شہر میں تعلیم پانے کے بعد اس نے عراق کے دارالحکومت بغداد جانے کا تہیہ کرلیا۔ کیونکہ ان دنوں بغداد میں ایک بہت بڑا مدرسہ قائم تھا۔ بغداد میں جب اس نے مدرسے میں حصہ لینا چاہا تو اس کے پھٹے پرانے کپڑوں کو دیکھ کر مدرسے کے منتظم نے صاف انکار کر دیا۔ اصل میں وہ کسی ایسے غریب لڑکے کو داخل نہیں کرنا چاہتے تھے جس کا لباس معمولی ہو اور اس کے پاس کتابوں کے لیے بھی پیسے نہ ہوں۔ مگر انہوں نے بہانا بنایا کہ ہمارے پاس تمہاری رہائش کے لیے کوئی کمرہ خالی نہیں۔ لڑکے نے جب یہ سُنا تو کہا: ''جنابِ عالی! میری رہائش کی آپ فکر نہ کریں۔ اس کا بندوبست مَیں خود کرلوں گا۔ آپ مجھے صرف داخلہ دے دیں۔'' چنانچہ اس کے شوق کو دیکھ کر اسے مدرسے میں داخلہ دے دیا گیا۔ اُدھر اس غریب لڑکے نے اپنی رہائش کے لیے شہر میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ یہ مکان بہت خراب تھا۔ اتنا خراب کہ شاید پورے بغداد میں اس سے گندا مکان کوئی نہ تھا۔ بات یہ تھی کہ اس کے اوپر ایک پرنالہ بہتا تھا جس کا گندا پانی اس کے کمرے کے اندر بھی آ جاتا تھا۔ اِس سے اُس لڑکے کے کپڑے خراب ہوجاتے تھے اور وہ رات کو باہر جا کر اپنے کپڑے دھوتا تھا تاکہ صبح پہن کر مدرسے جا سکے۔ اس کے علاوہ اسے کھانا بھی اچھا نصیب نہ تھا۔ بے چارہ روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرلیتا۔

ایک روز صبح صبح وہ لڑکا مدرسے کے دروازے پر پہنچا تو مدرسے کے چپڑاسی نے اُسے بتایا کہ منتظم صاحب نے آج اسے مدرسے کے اندر جانے سے روک دیا ہے۔ اس کے پوچھنے پر چپڑاسی نے بتایا کہ آج مُلک کے وزیرِاعظم نظام الملک طوسی مدرسے کا معائنہ کرنے کے لیے آ رہے ہیں کیونکہ یہ مدرسہ اُنہوں نے ہی بنوایا تھا۔ منتظم صاحب نہیں چاہتے کہ وزیرِاعظم کو یہ علم ہو کہ ان کے مدرسے میں کوئی ایسا غریب طالب علم بھی پڑھتا ہے جس کا لباس بہت معمولی ہے۔

لڑکے نے جب یہ سُنا تو اسے بہت افسوس ہوا۔ چنانچہ وہ

واپس گھر آ گیا اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ اُدھر نظام الملک طوسی مدرسے میں آئے تو انہوں نے منتظم صاحب سے کہا کہ مدرسے کے تمام ہونہار طالب علموں کو یہاں بلوایئے مَیں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ منتظم صاحب نے مدرسے کے ان تمام لڑکوں کو بُلا بھیجا جو بہت ہونہار سمجھے جاتے تھے۔ نظام الملک طوسی نے ان میں سے ہر ایک کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا: ''بیٹا! تم علم حاصل کر کے کیا کرو گے؟'' کسی نے جواب دیا کہ مَیں تعلیم حاصل کر کے بڑا افسر بنوں گا۔ کسی نے کہا کہ مَیں دنیا کی سیر کروں گا اور کسی نے کہا کہ مَیں خوبصورت عمارتیں بناؤں گا۔ یہ باتیں سُن کر نظام الملک کو سخت غصہ آیا۔ انہوں نے منتظم سے کہا:

''یہ کیسے ہونہار طالب علم ہیں جنہیں علم سے کوئی محبت ہی نہیں۔ مَیں نے مدرسہ اس لیے تو نہیں بنوایا تھا کہ لڑکے یہاں آ کر اپنا اور اپنے استادوں کا وقت ضائع کریں۔ اگر کل تک کسی لڑکے نے مجھے اپنے علم حاصل کرنے کا صحیح مقصد نہ بتایا تو مَیں مدرسے کو بند کرنے کا فیصلہ کر لوں گا۔''

یہ سُن کر منتظم اور مدرسے کے اُستاد سخت پریشان ہوئے کہ اب کیا کریں۔ مدرسے کے جن ہونہار لڑکوں پر انہیں بھروسہ تھا وہ ناکام ہو گئے تھے اور عام لڑکوں کو نظام الملک کے سامنے پیش کرنا فضول تھا۔ اب تو انہیں یقین ہو گیا کہ مدرسہ بند ہو جائے گا اور وہ بیکار ہو جائیں گے۔

ابھی وہ یہ باتیں سوچ ہی رہے تھے کہ اتنے میں ایک استاد نے کہا: ''مَیں ایک ایسے غریب طالب علم کو جانتا ہوں جو بہت محنتی بھی ہے۔ آج وہ مدرسے میں نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ کل ہم اس لڑکے کو نظام الملک کے سامنے پیش کریں۔ شاید وہی صحیح جواب دے سکے۔'' پہلے تو منتظم نے اس کی مخالفت کی مگر جب دوسرے استادوں نے بھی پہلے اُستاد کی تائید کی۔ تو وہ اس غریب لڑکے کو بلانے پر راضی ہو گئے۔ یہ وہی لڑکا تھا جسے اس روز مدرسے میں آنے سے منع کر دیا گیا تھا۔

دوسرے روز اس لڑکے کو بلا کر نظام الملک کے سامنے پیش کیا گیا۔ نظام الملک نے اس سے بھی وہی سوال کیا کہ ''بتاؤ بیٹا! تم علم حاصل کر کے کیا کرو گے؟''

لڑکے نے کہا: ''جنابِ عالی! علم حاصل کرنے کی خواہش مجھے یہاں تک لائی ہے۔ مَیں ایک خاص مقصد کے تحت علم حاصل کر رہا ہوں اور وہ مقصد ہے انسانوں کی خدمت کرنا۔ مَیں زندگی بھر اپنے علم

سے انسانوں کی خدمت کروں گا۔''

نظام الملک نے یہ جواب سنا تو خوش ہوکرلڑکے کو گلے لگالیا اور کہا: ''شاباش بیٹا! تم نے صحیح جواب دیا۔اب مَیں مدرسہ بندنہیں کروں گا۔ جہاں تم جیسے ہونہار طالب علم پڑھتے ہوں اس مدرسے کو بندنہیں کیا جا سکتا۔اسے ہمیشہ جاری رہنا چاہئے۔'' چنانچہ وہ مدرسہ جسے مدرسہ نظامیہ کہا جاتا تھا بعد میں ترقی کر کے ایک یونیورسٹی بن گیا۔ اگرخدانخواستہ اس روز مایوس ہوکرنظام الملک اسے بندکردیتے تو علم کا کتنا نقصان ہوتا۔

جس غریب طالب علم کے صحیح جواب سے وہ مدرسہ بند ہونے سے بچ گیا وہ بعد میں امام غزالیؒ کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔امام غزالی اسلامی دنیا کی بہت بڑی شخصیت تھے اور بچپن کے وعدے کے مطابق آخر دم تک انہوں نے اپنے علم سے انسانوں کی خدمت کی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غریبی امیری کوئی چیز نہیں۔ اگر انسان چاہے اور اسے سچا شوق ہوتو وہ غربت میں بھی علم کی دولت حاصل کر سکتا ہے۔

بے داغ محل

سلطان سبکتگین کا نام آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ مشہور مسلمان فاتح سلطان محمود غزنوی انہی کا بیٹا تھا۔ سلطان کا شاہی **محل** بہت خوبصورت تھا اور شہزادہ محمود کو اس پر بہت ناز تھا۔ایک دن **محل** کے پاس کچھ لڑکے کھیل رہے تھے۔ان میں شہزادہ بھی شامل تھا۔شہزادے نے اپنے **محل** کو دیکھ کر دوستوں سے کہا کہ ایسا خوبصورت **محل** دنیا میں کہیں نہ ہوگا۔ یہ سُن کر اس کا ایک دوست ابراہیم ہنسنے لگا۔ ''کیا بات ہے؟ تم میری بات پر ہنس کیوں رہے ہو؟'' شہزادے نے غصے سے پوچھا۔ابراہیم نے جواب دیا: ''محمود! تم اپنے **محل** کو کیا سمجھتے ہو؟ دنیا میں اس سے بھی اچھے **محل** موجود ہیں۔ ایسے خوبصورت کہ ان پر کوئی داغ نہیں۔'' شہزادے نے پوچھا: ''ہمارے **محل** میں تمہیں کیا خرابی نظر آئی ہے؟'' ابراہیم شہزادے کو **محل** کی ایک دیوار کے نیچے لے گیا اور اس سے کہا: ''ذرا اوپر دیکھو!'' شہزادے نے اوپر دیکھا تو دیوار پر ایک جگہ دھبہ دکھائی دیا۔شاید کسی بچے نے روشنائی سے بھرے ہوئے

ہاتھ اس پر لگا دیئے تھے۔ شہزادہ یہ دیکھ کر بہت شرمندہ ہوا۔ اسے اپنے دوست کی بات پر بڑا غصہ آیا۔ وہ اپنے باپ سے کہہ کر اسے سزا دلوانا چاہتا تھا۔

دوسرے دن بادشاہ نے دسترخوان پر جب شہزادے کو نہ دیکھا تو ملازموں سے پوچھا کہ شہزادہ کہاں ہے؟ معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ اس پر بادشاہ خود شہزادے کے پاس گیا اور اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ شہزادے نے ساری بات اپنے باپ کو بتا دی۔ اُسے اُمید تھی کہ اس کا باپ ابراہیم کو اس کی گستاخی پر سخت سزا دے گا۔ لیکن بادشاہ مسکرانے لگا۔ اس نے کہا: ''بس اتنی سی بات پر ناراض ہو؟ بیٹے! دیوار کے داغ کا خیال نہ کرو۔ اسے ہم آج ہی صاف کروا لیں گے۔'' یہ کہہ کر بادشاہ نے شہزادے کا ہاتھ پکڑا اور اسے دسترخوان پر لے گیا۔

رات کو سونے کے لیے شہزادہ پلنگ پر لیٹا تو اسے رہ رہ کر ابراہیم کی گستاخی کا خیال آتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسی ترکیب ہو جس سے وہ اپنے دوست کو شرمندہ کر سکے اور اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکے۔ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ صبح اٹھ کر وہ اپنے باپ سلطان سبکتگین کے پاس گیا اور اسے کہنے لگا: ''ابا جان! مَیں نے سوچا ہے کہ مَیں ایک نیا **محل** بنواؤں جو اتنا خوبصورت ہو کہ اسے دیکھ کر ابراہیم شرمندہ ہو جائے۔'' بادشاہ نے کہا: ''جیسے تمہاری مرضی۔'' چنانچہ دوسرے دن ہی شہزادے نے شہر سے باہر ایک عالیشان **محل** بنوانا شروع کر دیا۔ اس نے شاہی معمار سے کہا کہ اگر یہ **محل** واقعی بہت خوبصورت ہوا تو مَیں خوش ہو کر تمہیں مالا مال کر دوں گا۔ **محل** چند مہینوں میں تیار ہو گیا اور وہ واقعی اس قدر شاندار تھا کہ جو بھی اسے دیکھتا تعریف کیے بغیر نہ رہا۔ سب نے **محل** کی تعریف کی۔ لیکن سلطان خاموش رہتا۔ ایک روز شہزادے نے سلطان کو **محل** دیکھنے کی دعوت دی۔ بیٹے کے اصرار پر سلطان نئے **محل** کی سیر کے لیے چل پڑا جب وہ **محل** کے سامنے پہنچا تو پھر بھی خاموش رہا۔ لیکن جب **محل** کے دروازے میں داخل ہونے لگا تو وہ رک گیا اور کہنے لگا: ''بیٹے! تم نے یہ نیا **محل** اس لیے بنوایا ہے کہ پہلے **محل** کی دیوار پر داغ پڑ گیا تھا؟''

''جی ابا جان!'' شہزادے نے جواب دیا۔ ''تو یہ دیکھو!'' یہ کہہ کر سلطان نے اپنی چھڑی کی نوک سے دیوار پر ایک لکیر ڈال دی جس سے دیوار کی ساری خوبصورتی ختم ہو گئی۔ سلطان نے کہا: ''بیٹے!

اگر اُس محل کی ایک دیوار پر داغ پڑا تھا تو اس نئے محل کی دیوار بھی داغ سے محفوظ نہیں ۔ دنیا کے خوبصورت سے خوبصورت محل پر بھی کوئی نہ کوئی داغ پڑ سکتا ہے ۔مَیں یہ چاہتا ہوں کہ تم کوئی ایسا محل تعمیر کرو جس کی کسی دیوار پر کوئی داغ نہ پڑے۔'' یہ سُن کر شہزادے نے کچھ دیر تک سوچا۔ پھر کہا: ''ابا جان! آپ درست فرماتے ہیں ۔محل کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو ایک نہ ایک دن خراب ہو جاتا ہے ۔مَیں کوئی ایسا کارنامہ انجام دوں گا جو ایک بےداغ محل کی طرح ہمیشہ چمکتا رہے۔''

محمود نے یہ وعدہ اس وقت پورا کیا جب وہ سلطان محمود غزنوی بن چکا تھا۔ سلطان محمود اپنی بہادری کے کارناموں اور علم دوستی کی وجہ سے تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کا نام ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

ہُنر اور سفر

کردار

☆ بادشاہ

☆ وزیرِاعظم

☆ شہزادہ

☆ نانبائی

پہلا منظر

بادشاہ کا محل

بادشاہ: (شہزادے سے) بیٹے! مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔

شہزادہ: جی ابا حضور! فرمایئے۔

بادشاہ: ماشاءاللہ! اب تم جوان ہو گئے ہو، تعلیم بھی حاصل کر چکے ہو۔ بہتر ہے کہ اب تم تخت سنبھالو کیونکہ مَیں بوڑھا ہو گیا ہوں۔

شہزادہ: آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رہے۔مَیں

آپ کی موجودگی میں یہ گستاخی کیسے کرسکتا ہوں؟

بادشاہ: یہ ہماری خواہش ہے۔

شہزادہ: آپ کا ارشاد بجا......مگر

بادشاہ: مگر کیا؟

شہزادہ: ابا حضور! مَیں نے تعلیم تو حاصل کر لی ہے لیکن میرے اُستاد کا کہنا ہے کہ جب تک کوئی ہنر نہ سیکھا جائے اور گھوم پھر کر دُنیا کی سیر نہ کی جائے انسان مکمل نہیں ہوتا۔

بادشاہ: تو پھر؟

شہزادہ: جی! ابا حضور......میرا ارادہ ہے کہ کوئی ہنر سیکھ کر دنیا کی سیر کے لیے نکلوں۔

بادشاہ: ٹھیک ہے۔

شہزادہ: تو ابا حضور! مجھے اجازت دیجئے کہ مَیں کوئی ہنر سیکھ لوں۔

بادشاہ: میری طرف سے اجازت ہے۔لیکن ہنر تم کون سا سیکھو گے۔

شہزادہ: ابا حضور! میرے استاد قالین بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔میرا ارادہ بھی ان سے یہی ہنر سیکھنے کا ہے۔

بادشاہ: بہت خوب۔

شہزادہ: تو ابا حضور! یہ ہنر سیکھنے کے بعد مجھے دنیا کے سفر پر نکلنے کی اجازت ہے؟

بادشاہ: ٹھیک ہے......جس طرح تمہاری مرضی۔

دوسرا منظر

نانبائی کی دکان

شہزادہ: (نانبائی سے) بھائی! مَیں بھوکا تھا۔تم نے مجھے کھانا کھلایا۔مَیں تمہارا شکرگزار ہوں لیکن یہ کیا کہ تم نے مجھے اپنی قید میں ڈال دیا ہے؟

نانبائی: نوجوان! مَیں بظاہر تو نانبائی کا کام کرتا ہوں لیکن میرا خفیہ کاروبار غلاموں کی خرید وفروخت ہے۔

شہزادہ: (حیرت سے) جی؟

نانبائی: ہاں ...... (قہقہہ لگاتے ہوئے) اب تم میری قید میں ہو۔میرے غلام ہو اور مناسب وقت آنے پر مَیں تمہیں کسی کے ہاتھ فروخت کردوں گا۔

شہزادہ: یعنی مَیں فروخت کردیا جاؤں گا؟

نانبائی: ہاں ......بہتر یہ ہے کہ خاموشی سے وقت گزار دو۔

شہزادہ: تم مجھے کب تک فروخت کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟

نانبائی: کچھ نہیں کہا جا سکتا ......اس کام میں ایک مہینہ بھی لگ سکتا ہے اور ایک سال بھی۔

شہزادہ: اتنا عرصہ مَیں یہاں بیکار پڑا رہوں گا؟

نانبائی: تو پھر کیا؟

شہزادہ: مَیں اتنا عرصہ بیکار تمہاری روٹیاں توڑتا رہوں گا؟

نانبائی: ہوں۔

شہزادہ: تو پھر بہتر یہ ہے کہ تم میرے ہنر سے فائدہ حاصل کرو۔

نانبائی: تمہارے پاس کیا ہنر ہے؟

شہزادہ: مجھے قالین بنانے کا ہنر آتا ہے۔

نانبائی: (حیرت سے) یہ تو بہت اچھا ہے۔

شہزادہ: تو پھر مجھے سامان لا دو تاکہ مَیں آج سے ہی کام شروع کر دوں۔

نانبائی: ٹھیک ہے ...... مَیں آج ہی تمہیں سامان لا دیتا ہوں۔تم اپنے فن کا پورا زور اس قالین پر صَرف کر دو۔ مَیں یہ قالین بادشاہ کے حضور پیش کر کے معقول انعام و اکرام حاصل کروں گا۔

شہزادہ: تم فکر نہ کرو۔انشاءاللہ مَیں ایسا اعلیٰ قالین بناؤں گا کہ اس کی قیمت سے تمہارے تمام دلدر دور ہو جائیں گے۔

تیسرا منظر

بادشاہ کا دربار

بادشاہ: (وزیراعظم سے) وزیراعظم! کوئی ملاقاتی ہو تو اسے پیش کیا جائے!

وزیراعظم: جہاں پناہ! قالینوں کا ایک تاجر آیا ہے۔ وہ آپ کی خدمت میں ایک نادر قالین پیش کرنا چاہتا ہے۔

بادشاہ: پیش کیا جائے۔

(وقفہ)

نانبائی: حضور! مَیں نے یہ قالین خاص طور پر آپ کے لیے بنوایا ہے۔دیکھیے کتنا نادر اور نفیس ہے!

بادشاہ: ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے ......وزیراعظم!

وزیراعظم: جی حضورِ عالی!

بادشاہ: وزیراعظم! قالین کو غور سے دیکھو! اس کے فن کے

مطابق تاجر کو انعام دیا جائے۔

وزیراعظم: (قالین کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) بادشاہ سلامت!

بادشاہ: کہو وزیراعظم!

وزیراعظم: اس تاجر کو فوراً قید کر دیا جائے۔

نانبائی: ح ...... ح ...... ح حضور! میرا قصور؟

بادشاہ: اس کا جرم کیا ہے؟ وزیراعظم!

وزیراعظم: اس کا جرم؟ اس کا جرم یہ ہے جہاں پناہ! کہ یہ بردہ فروش ہے۔ اس نے اس قالین بنانے والے کے علاوہ بہت سے نوجوان اپنے گھر میں قید کر رکھے ہیں۔

بادشاہ: اس کا ثبوت؟

وزیراعظم: اس کا ثبوت یہی قالین ہے بادشاہ سلامت! یہ دیکھیے قالین پر قالین بُننے والے نے بڑی مہارت سے اپنی رام کہانی لکھ دی ہے۔

بادشاہ: یہ شخص تو بڑا ظالم ہے ...... ہم حکم دیتے ہیں کہ اسے فوراً قید کر دیا جائے۔ اور سپاہیوں کا ایک دستہ اس کے ٹھکانے پر روانہ کر کے قالین بُننے والے نوجوان اور دوسرے قیدیوں کو آزاد کرایا جائے۔

وزیراعظم: حکم کی تعمیل ہوگی جہاں پناہ!

(وقفہ)

بادشاہ: قیدیوں کو ہمارے حضور پیش کیا جائے!

وزیراعظم: بہت بہتر حضور!

بادشاہ: (حیرت سے) ہیں ...... یہ کیا؟ ان قیدیوں میں تو ہمارا شہزادہ بھی ہے۔

شہزادہ: جی ابا حضور!

بادشاہ: مگر یہ سب کیا ہے؟

شہزادہ: ابا حضور! وہ قالین میرا ہی بُنا ہوا تھا۔ اور مَیں نے ہی اس میں اپنی قید کا سارا حال لکھا تھا۔

بادشاہ: بہت خوب ...... بہت خوب!

شہزادہ: ابا حضور! یہ سب میرے ہنر کا کمال ہے۔

بادشاہ: واقعی ...... ہنر کبھی نہ کبھی ضرور کام آتا ہے اور سفر کیے بغیر انسان ادھورا رہتا ہے۔

بادشاہ کا انصاف

کردار

- ☆ راوی
- ☆ جہانگیر
- ☆ وزیراعظم
- ☆ غلام
- ☆ عورت

راوی: ہندوستان میں ایک بادشاہ گزرا ہے۔ اس کا نام جہانگیر تھا۔ دوسری خوبیوں کے علاوہ ایک بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ وہ بہت انصاف پسند تھا۔ اسے اپنے عوام کی بھلائی کا بہت خیال تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا میں سے کسی آدمی کے ساتھ بھی کوئی ظلم یا زیادتی نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اپنے محل کے باہر ایک بڑی سی زنجیر لٹکا رکھی تھی کہ جس کسی کو کوئی شکایت ہو وہ اس زنجیر کو ہلائے۔ زنجیر کے آخری سرے پر ایک گھنٹی بندھی تھی۔ جب زنجیر ہلنے لگتی تو گھنٹی بجنا شروع ہوجاتی۔ اس طرح بادشاہ کو معلوم ہو جاتا کہ کوئی فریادی فریاد لے کر آیا ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ جہانگیر آرام کر رہا تھا۔ اتنے میں زنجیر ہلنے سے گھنٹی بجنے کی آواز آنے لگی۔

پہلا منظر

بادشاہ کا محل

جہانگیر: (تالی بجاتے ہوئے) کوئی ہے؟

غلام: جہاں پناہ! غلام حاضر ہے۔

جہانگیر: دیکھو! کون فریادی اس وقت ہمارے حضور آیا ہے؟

غلام: بہت بہتر حضور!

(وقفہ)

غلام: جہاں پناہ! ایک عورت ہے۔

جہانگیر: اسے ہمارے حضور پیش کیا جائے۔

غلام: بہت بہتر جہاں پناہ!

(وقفہ)

عورت: (روتے ہوئے) دہائی ہے بادشاہ سلامت ...... دہائی ہے۔

جہانگیر: کیا بات ہے خاتون؟

عورت: جہاں پناہ! مَیں لُٹ گئی ...... برباد ہوگئی۔

جہانگیر: صاف صاف بتاؤ ......کیا بات ہے؟

عورت: میرے ساتھ ظلم ہوا ہے سرکار!

جہانگیر: کُھل کر بتاؤ ......کیا ظلم ہوا ہے؟

عورت: حضور! (روتے ہوئے) میرا سہاگ لُٹ گیا۔ میرا شوہر مارا گیا ہے۔

جہانگیر: بہت افسوس کی بات ہے۔ لیکن اس کا قاتل کون ہے؟

عورت: حضور! کچھ کہہ نہیں سکتی۔

جہانگیر: بے جھجک ہو کر بتاؤ کہ تمہارے شوہر کا قاتل کون ہے؟ ہم انصاف کریں گے۔

عورت: حضور! آپ سے انصاف ہی کی توقع ہے۔

جہانگیر: پھر کیا ہے؟

عورت: جہاں پناہ! چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔

جہانگیر: آخر وہ ایسی کون سی بات ہے جو تمہارے ہونٹوں تک نہیں آ سکتی؟

عورت: حضور کا اقبال بلند ہو۔ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ مَیں ......

جہانگیر: ڈرو نہیں۔ بتاؤ کہ تمہارے شوہر کا قاتل کون ہے؟

عورت: حضور! بتا تو دوں۔ لیکن ڈرتی ہوں کہ کہیں حضور کا انصاف بھی نہ ڈگمگا اٹھے۔

جہانگیر: نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ (غصے سے) قاتل کا نام بتا دو۔ ورنہ ہم یہی سمجھیں گے کہ تم جھوٹی ہو۔

عورت: عالی جاہ! کیا بتاؤں؟

جہانگیر: بتاؤ ...... بتاؤ ......ہم پورا پورا انصاف کریں گے۔

عورت: تو سنیئے جہاں پناہ! میرے شوہر کی قاتل آپ کی ملکہ معظّمہ ہیں۔

جہانگیر: (حیرت سے) ملکہ معظّمہ؟

عورت: جی حضور!

جہانگیر: مگر ...... یہ کیسے؟

عورت: حضور! ملکہ عالیہ اب سے کچھ دیر پہلے شاہی محل کے مغربی برج پر تیر اندازی کی مشق فرما رہی تھیں۔

جہانگیر: (بیتابی سے) پھر کیا ہوا؟

عورت: ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور میرے شوہر کے سینے کے پار ہوگیا۔اور وہ وہیں اسی وقت مر گیا۔

جہانگیر: تمہارا شوہر اس وقت کہاں تھا؟

عورت: حضور! ہم دھوبی ہیں اور شاہی محل کے باہر دریا کے دوسرے کنارے پر مَیں اور میرا شوہر کپڑے دھو رہے تھے کہ یہ واقعہ پیش آیا۔

جہانگیر: ٹھیک ہے ...... ٹھیک ہے مظلوم عورت! تمہارے ساتھ انصاف ہو گا۔ کل بھرے دربار میں ہم اس مقدمے کا فیصلہ کریں گے۔اب تم جا سکتی ہو۔

دوسرا منظر

بادشاہ کا دربار

جہانگیر: (وزیرِاعظم سے) وزیرِاعظم!

وزیرِاعظم: جی عالم پناہ!

جہانگیر: فریادی عورت کو حاضر کیا جائے۔

وزیرِاعظم: بہت بہتر جہاں پناہ!

(مختصر وقفہ)

وزیرِاعظم: عالم پناہ! فریادی عورت حاضر ہے۔

جہانگیر: فریادی اپنا مقدمہ پیش کرے۔

فریادی عورت: حضور! کل ملکہ عالیہ شاہی محل کے مغربی برج پر کھڑی تیر چلانے کی مشق فرما رہی تھیں کہ ایک تیر آیا اور میرے شوہر کو آ کے لگا جس سے وہ وہیں مر گیا۔

جہانگیر: تمہیں پورا یقین ہے کہ قاتل ہماری ملکہ ہیں؟

عورت: جی حضور!

جہانگیر: تو ہمارا انصاف یہ کہتا ہے کہ خون کا بدلہ خون ہونا چاہیئے۔

عورت: (حیرت سے) جی؟

جہانگیر: ہاں ......خون کا بدلہ خون ......ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ملکہ نے چونکہ تمہارا سہاگ اُجاڑا ہے اس لیے جواب میں تم ملکہ کا سہاگ اُجاڑ دو۔

عورت: جی ......جی ......مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ عالم پناہ!

جہانگیر: انصاف یہی کہتا ہے ...... یہ لو تیر اور کمان اور جس طرح ملکہ نے تیر چلا کر تمہارے شوہر کو قتل کر دیا۔ اسی طرح تم بھی اس کا بدلہ ہم پر تیر چلا کر لے سکتی ہو ...... چلاؤ تیر!

عورت: (روتے ہوئے) نہیں ......نہیں ......حضور! ایسا نہیں ہوسکتا۔ مَیں اپنے سہاگ کی خاطر ملکہ عالیہ کا سہاگ نہیں اجاڑ سکتی۔ ایسے انصاف پسند بادشاہ کا خون نہیں کر سکتی۔

جہانگیر: نہیں ......یہ نہیں ہوسکتا ......یہ ہمارا حکم ہے۔

عورت: مگر ......مگر عالم پناہ! مَیں معاف بھی تو کر سکتی ہوں۔

جہانگیر: یہ تمہیں اختیار ہے۔

عورت: تو ......تو مَیں اپنے شوہر کی موت کو تقدیر سمجھ کر قبول کرتی ہوں اور ......اور ملکہ عالیہ کو معاف کرتی ہوں ...... مجھے انصاف مل گیا ہے۔

باپ کی دُعا

کردار

- ☆ راوی
- ☆ بابر
- ☆ ہمایوں
- ☆ شاہی طبیب

راوی: ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ظہیر الدین بابر نے رکھی۔ **1526**ء میں وہ پورے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ بابر بچپن ہی سے سخت اور سپاہیانہ زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ بڑے مضبوط جسم اور پکّے ارادے کا مالک تھا۔ اتنا طاقتور تھا کہ دو آدمیوں کو اپنی بغلوں میں دبا کر آگرے کے قلعے کی فصیل پر بھاگ سکتا تھا۔ اُسے

تیرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ اس نے برصغیر کے تمام دریا خود تیر کر پار کیے تھے۔ بابر علم وادب کا سرپرست ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی ترکی زبان کا شاعر اور ادیب تھا۔ اس نے اپنے حالاتِ زندگی تزکِ بابری کے نام سے ایک کتاب میں لکھے ہیں۔ آخر 1530ء میں وہ وفات پا گیا۔ لیکن اس کی موت کا واقعہ بھی عجیب ہے۔

شاہی محل کا منظر

بابر: (اداس اور غمگین آواز میں) شاہی طبیب! ہمارے بیٹے نصیر الدین کا اب کیا حال ہے؟

طبیب: ظلِ سبحانی! کیا عرض کر سکتا ہوں؟

بابر: کیا مطلب؟

طبیب: ظلِ سبحانی! زبان زیب نہیں دیتی۔

بابر: جو کچھ کہنا چاہتے ہو۔ صاف صاف کہو۔

طبیب: جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔

بابر: جلدی سے کہو۔

طبیب: ظلِ سبحانی! مَیں نے شہزادہ نصیر الدین کا بہت علاج کیا۔ لیکن جو دوا دی جاتی ہے اس کا اثر الٹا ہوتا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں اب دوا نہیں دُعا کا وقت ہے۔

بابر: یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ شاہی طبیب!

طبیب: ظلِ سبحانی! مَیں نے جو کچھ عرض کیا ہے دوسرے تمام طبیبوں کا بھی یہی خیال ہے۔

بابر: نہیں ......نہیں ...... ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم مغلیہ سلطنت کے وارث ...... اپنے پیارے بیٹے نصیر الدین کو مرنے نہیں دیں گے۔ ہم اپنے آپ کو اس کی جان کے صدقے میں پیش کر دیں گے۔

(وقفہ)

راوی: ایک دن بابر نے شاہی لباس اور تاج اتار کر سادہ لباس پہنا۔ وَضو کیا اور اپنے بیمار بیٹے نصیر الدین ہمایوں کی چار پائی کے گرد تین چکر لگائے اور آخر میں مصلّے پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور دُعا مانگنے لگا۔

بابر: (روتے ہوئے) اے خدا! اے دونوں جہانوں کے پالنے والے! میرا پیارا بیٹا نصیر الدین سخت بیمار ہے اور

مرنے کے قریب ہے۔ میرے بعد مغلیہ سلطنت کا یہی وارث ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو خاندانِ تیموریہ کا چراغ گُل ہو جائے گا۔ خدایا! اسے بچا لے اور اس کی بیماری مجھے دے دے اور اس کے بدلے میں مجھے موت دے دے۔ مَیں اس کے بدلے میں مرنے کو تیار ہوں۔

(وقفہ)

راوی: چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بابر کی دُعا قبول ہوگئی۔ اس کا صدقہ منظور ہوا۔ ہمایوں صحت یاب ہونے لگا اور بابر بیمار...... آخر ہمایوں بالکل تندرست ہوگیا اور بابر وفات پا گیا۔ بیٹے کے لیے باپ کی یہ قربانی ایک انوکھی مثال ہے جو ہمیشہ یادگار رہے گی۔

نوعمر مجاہد

کردار

☆ راجہ داہر ...... سندھ کا حکمران
☆ جے سنگھ ...... راجہ داہر کا بیٹا
☆ محمد بن قاسم ...... مسلمان فوج کا سپہ سالار
☆ ایلچی
☆ دربان
☆ سندھی سپہ سالار
☆ اور بہت سے سپاہی

پہلا منظر

راجہ داہر کا دربار

راجہ داہر: جے سنگھ! بصرے کے حاکم حجاج بن یوسف کا یہ خط دیکھا ہے؟

جے سنگھ: جی نہیں مہاراج!

راجہ داہر: (مسکراتے ہوئے) لکھا ہے ......عربوں کے جہاز لوٹنے والے ڈاکوؤں کو سخت سزا دی جائے اور تمام عرب قیدیوں کو ان کے مال واسباب سمیت آزاد کر دیا جائے ......ورنہ۔

جے سنگھ: (بات کاٹتے ہوئے) ورنہ کیا مہاراج؟

راجہ داہر: (قہقہہ لگاتے ہوئے طنزیہ انداز میں) ورنہ ...... نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی ......(قہقہہ)

جے سنگھ: خوب ......تو گویا چند ملک فتح کرنے کے بعد اب مسلمان سندھ کی فتح کا بھی خواب دیکھنے لگے ہیں۔

راجہ داہر: (ہنستے ہوئے) خیر یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا ...... جے سنگھ! تم یہ بتاؤ! وہ مسلمان قیدی اس وقت کہاں ہیں؟

جے سنگھ: مہاراج! شاہی قید خانے میں۔

راجہ داہر: ہوں ...... ان کا مزاج درست ہوا یا ابھی تک وہ ہمارے خلاف ہیں؟

جے سنگھ: ان میں سے ایک قیدی کل یہ کہہ رہا تھا کہ ظلم کے دن تھوڑے ہیں۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے ......ایک نہ ایک دن راجہ کو منہ کی کھانی پڑے گی اور ......

راجہ داہر: (بات کاٹتے ہوئے غصے سے) بس بس ...... اُس بدزبان کی زبان کھینچ دو۔

جے سنگھ: اور ایک قیدی لڑکی ہر وقت حجاج کی دہائی دیتی رہتی ہے۔

راجہ داہر: اُسے کہو! کہ اس کی مدد کے لیے اتنی دور سے حجاج تو کیا ایک چڑیا بھی نہیں پہنچ سکتی۔(قہقہہ)

جے سنگھ: مہاراج! قیدی کچھ زیادہ ہی حد سے بڑھ رہے ہیں۔

راجہ داہر: انہیں ان کی گستاخی کی پوری پوری سزا دی جائے گی۔ جے سنگھ! ان سب کو کوڑے مار مار کر لہولہان کر دو تا کہ پھر کبھی ایسی گستاخی نہ کر سکیں۔

جے سنگھ: بہت بہتر مہاراج!

(وقفہ)

دربان: مہاراج! ایک ایلچی حاضر ہونا چاہتا ہے۔

راجہ داہر: آنے دو!

(وقفہ)

راجہ داہر: تم کون ہو؟

ایلچی: مَیں مسلمان فوج کے سپہ سالار کا پیغام لے کر آیا ہوں۔

راجہ داہر: کہو!

ایلچی: ہمارے سپہ سالار نے آپ کے لیے یہ خط دیا ہے۔

راجہ داہر: (خط کھول کر پڑھتے ہوئے) اے راجہ! تمھیں اگر اپنے فوجی ساز و سامان پر ناز ہے تو ہمیں صرف خدا پر بھروسہ ہے۔ ہار جیت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ بہتر ہے کہ ہمارے قیدی واپس کر دو۔ ورنہ اسی خط کو ہماری طرف سے اپنے خلاف اعلانِ جنگ سمجھو۔ فقط محمد بن قاسم۔ (لہجہ تبدیل کرتے ہوئے غصے سے) ایلچی! ہماری طرف سے انہیں کہہ دو کہ ہم ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔

(ایلچی چلا جاتا ہے)

راجہ داہر: (اپنی فوج کے سپہ سالار سے مخاطب ہوتے ہوئے) یہ محمد بن قاسم کون ہے؟

سپہ سالار: مسلمان فوج کا نوعمر سپہ سالار مہاراج! جس نے کچھ عرصہ پہلے دیبل کو فتح کیا تھا۔

راجہ داہر: دیبل کا نام نہ لو ...... وہاں تو ہماری فوجیں بڑی بے جگری سے لڑی ہیں۔ البتہ عربوں کی منجنیق کے پتھروں سے شہر کے مندر کا سرخ جھنڈا گرا تو وہاں کے لوگوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ ورنہ وہاں مسلمانوں کو قدم جمانے کی کبھی جرأت نہ ہوتی۔

سپہ سالار: ٹھیک ہے مہاراج!

راجہ داہر: اور ہاں ......تم نے دیکھا کہ یہ مسلمان کتنے گستاخ ہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ سندھ کے راجہ کو کس طرح مخاطب کرنا چاہیئے۔

سپہ سالار: مہاراج درست ہے ......مگر جو قوم قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت اپنے پاؤں تلے روند چکی ہو اس کے لیے سندھ کی حکومت کیا معنی رکھتی ہے؟

راجہ داہر: کیا مطلب؟

سپہ سالار: مطلب یہ کہ یہ قوم آسانی کے ساتھ ہم سے ٹکر لے سکتی ہے۔

راجہ داہر: یہ تم کہہ رہے ہو سندھ کے سپہ سالارِ اعظم؟

سپہ سالار: جی ہاں مہاراج! دیبل کی لڑائی میں ہم ان کی بہادری اور جوانمردی کا لوہا مان چکے ہیں۔ میرے خیال میں تو ہمیں ان کے قیدی واپس کر دینے چاہئیں۔

راجہ داہر: تو تمہارا مطلب ہے ہم ان سے ہار مان لیں۔

سپہ سالار: نہیں مہاراج! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہماری فوج ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلکہ ہمیں امن و آشتی سے رہنا چاہیئے تاکہ مسلمانوں کا یہ سیلاب جو عراق سے آیا ہے خاموشی سے لوٹ جائے ورنہ......

راجہ داہر: (غصے سے بات کاٹتے ہوئے) ورنہ کیا؟

سپہ سالار: مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں مہاراج کا تخت و تاج بھی اس طوفان کی لپیٹ میں نہ آ جائے۔

راجہ داہر: وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔

سپہ سالار: اگر مہاراج کا مطلب اعلانِ جنگ سے ہے تو مَیں فوج کو تیاری کا حکم دوں؟

راجہ داہر: نہیں ...... اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہماری فوج تیاری کے بغیر بھی جب چاہے ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ پھر تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ مسلمان فوج کا سپہ سالار ایک سترہ سالہ لڑکا ہے ...... یہ سترہ سالہ لڑکا بھلا ہمارے ساتھ کیا لڑے گا؟ ہوں ...... (ہنستے ہوئے) سترہ سالہ لڑکا...... محمد بن قاسم......(قہقہے)

(وقفہ)

سپہ سالار: مہاراج! ابھی ابھی ہمارے جاسوسوں نے ایک بہت بُری خبر دی ہے۔

راجہ داہر: کیا ہے؟

سپہ سالار: مہاراج! مسلمانوں کا لشکر اس طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

راجہ داہر: تو آنے دو...... دیکھا جائے گا۔

سپہ سالار: نہیں مہاراج ...... یہ تو بہت برا ہوا۔ بہت بُرا...... رام کرے وہ دریا کو پار ہی نہ کر سکیں۔

راجہ داہر: ہاں ...... اول تو وہ اس طغیانی میں دریا کو پار ہی نہیں کر سکتے اور اگر کسی طرح کر بھی لیں تو ان کے مقابلے کے لیے ہماری بہادر اور چوکس فوج موجود ہے۔

سپہ سالار: بے شک مہاراج!

دوسرا منظر

دریا کے کنارے

محمد بن قاسم: (اپنے سپاہیوں سے) اسلام کے بہادر سپاہیو! تمہاری رگوں میں بہادر مسلمانوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ تم ایک خدا اور ایک رسول کے ماننے والے ہو۔ تمہارے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو بتوں کو پوجتے ہیں ......موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم زندہ رہ گئے تو غازی ہو گے۔ اور مر گئے تو شہید کہلاؤ گے۔ تم جانتے ہو کہ فتح ہمیشہ حق کا مقدر رہی ہے۔ ہم حق پر ہیں اس لیے فتح بھی یقیناً ہماری ہوگی۔

مسلمان سپاہی: (ایک آواز ہو کر) انشاء اللہ

محمد بن قاسم: ساتھیو! دریا بپھرا ہوا ہے۔ مگر تم جانتے ہو کہ اس کو پار کر کے ہی ہم اسلام کے دشمنوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تم ایک ایک کشتی کو رسوں سے باندھ کر دریا میں ڈال دو تا کہ پُل بن جائے۔ خدا ہماری مدد کرے گا۔

(وقفہ)

راجہ داہر: (شور سُن کر) یہ کیسا شور ہے جے سنگھ؟

جے سنگھ: مہاراج! مسلمانوں نے رات کو دریا پار کر کے ہمارے محافظ دستوں کو تہس نہس کر دیا ہے اور اب وہ قلعے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

راجہ داہر: (غصے سے) ان کی یہ جرأت ......سپہ سالارِ اعظم! کیا یہ درست ہے؟

سپہ سالار: جی مہاراج!

راجہ داہر: (حقارت سے) ہوں ...... یہ سترہ سالہ لڑکا ہم سے جنگ کرے گا۔ (غصے سے) اسے اس کی موت یہاں لے آئی ہے۔ اب آیا ہے تو زندہ نہ جانے پائے۔ اس کو وہ مزہ چکھاؤ کہ پھر کبھی ایسی حماقت نہ کرے۔

سپہ سالار: بہت بہتر مہاراج!

تیسرا منظر

میدانِ جنگ

(شور بڑھتا ہوا قریب آ جاتا ہے۔ نعرۂ تکبیر کی آوازیں

نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ جنگ کا بگل بجتا ہے۔تلواروں کی جھنکار اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز)

محمد بن قاسم: سپاہیو! آگے بڑھو! وہ دیکھو! ایک سفید ہاتھی پر دشمنِ اسلام راجہ داہر بیٹھا ہے۔ بچنے نہ پائے۔شاباش۔

(شور میں چیخوں کی آوازیں۔آہستہ آہستہ شور کم ہوتا ہے)

محمد بن قاسم: (فتح کے بعد سندھ کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے) اے سندھ کے رہنے والو! تم خوف کے مارے کانپ رہے ہو کہ فتح کے بعد نہ جانے تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔تم ہمارے غلام نہیں۔آزاد ہو ...... ہم یہاں کسی کو غلام بنانے نہیں آئے۔ بلکہ اُس ظلم وستم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے آئے ہیں جو یہاں کے حاکم تم پر ڈھاتے رہے ہیں۔ ہمارا مذہب اسلام ذات پات اور اونچ نیچ کے خلاف ہے۔ہمارے دین میں سب انسان برابر ہیں۔

سپاہی: نعرۂ تکبیر ......اللہ اکبر......محمد بن قاسم زندہ باد!

اتفاق میں برکت

اک گاؤں میں تھا اک بوڑھا
بوڑھا تھا وہ نیک اور دانا
کھیتی باڑی کرتا تھا وہ
اللہ کا دم بھرتا تھا وہ
قدرت نے اس کو بخشے تھے
سات جوان اور گبھرو بیٹے
لیکن آپس میں سب لڑکے
لڑتے تھے وہ اور جھگڑتے
دھینگا مشتی مار کٹائی
رہتی تھی ہر وقت لڑائی
دیکھ کے باپ بہت کڑھتا تھا
اُن کی حالت پر روتا تھا

اُن کو سمجھاتا تھا بوڑھا
نہیں ہے اچھا ہر دم لڑنا
لیکن وہ جھگڑالو لڑکے
اُس کی بات کہاں سنتے تھے؟
یونہی تھے وہ لڑتے رہتے
اک اک بات پہ اڑتے رہتے
آخر اک دن عاجز آیا
بوڑھے نے لڑکوں کو بُلایا
کہنے لگا ''جنگل کو جاؤ
واں سے اک اک ٹہنی لاؤ!''
لڑکے جب جنگل سے آئے
سارے اک اک ٹہنی لائے
بوڑھے نے پھر آگے بڑھ کر
ٹہنیاں لے کر باندھا گٹھر
پاس بلایا اک لڑکے کو
اور کہا یہ اُس بیٹے کو

''بیٹا! توڑو تو یہ گٹھر
اپنا پورا زور لگا کر''
لڑکے نے جب زور لگایا
ایک بھی ٹہنی توڑ نہ پایا
دوسرے کو پھر اس نے بلایا
اُس نے بھی اب زور لگایا
توڑ نہ پایا ہرگز وہ بھی
اُس گٹھر کی ایک بھی ٹہنی
آخر اک اک کر کے سارے
زور لگا کر رہ گئے لڑکے
توڑ نہ پائے ہرگز گٹھر
ہار گئے وہ زور لگا کر
تب بوڑھے نے گٹھر کھولا
پھر وہ اُن لڑکوں سے بولا
''میرے پیارے ناداں بچو!
اک اک ٹہنی لے کر توڑو!''

ہر اک نے لے کر اک ٹہنی
پل بھر میں وہ توڑ کے رکھ دی
اس پر بوڑھا اُن سے بولا
''تم نے غور سے یہ سب دیکھا؟
ٹہنیاں جب سب بندھی ہوئی تھیں
اک گٹھر میں کسی ہوئی تھیں
توڑ نہ پائے تھے تم ان کو
آخر کیا طاقت تھی سوچو؟
ٹہنیاں ساری اک اک کر کے
ٹوٹ گئیں کس آسانی سے
رہو گے جب تک تنہا تنہا
ہر اک تم کو توڑ سکے گا
ہو جاؤ گر یکجا سارے
کوئی تمہیں پھر توڑ نہ پائے
اس سے سبق یہ اچھا سیکھو!
مل جل کر تم رہنا سیکھو!
مل جل کر رہنے میں برکت
مل جل کر رہنے میں طاقت
مل جل کر رہنا ہے دولت
مل جل کر رہنا ہے عزت

❁

لالچ کا انجام

اک دن ایک گھنے جنگل میں
تین مسافر گزر رہے تھے
تینوں راہی آپس میں تھے
دوست نہایت ہی وہ گہرے
سوچا شہر کی جانب جائیں
تاکہ اپنی روزی پائیں
صبح کو تھے وہ گھر سے نکلے
شام ہوئی تو جنگل پہنچے
چلتے چلتے ہوا اندھیرا
اندیشوں نے ان کو گھیرا
برگد کے اک پیڑ کے نیچے
رات بسر کرنے کو ٹھہرے

دیکھا تو اک بڑی سی تھیلی
اُس برگد کے پاس پڑی تھی
پہلے تو وہ ڈرے ذرا سے
بیٹھے اُس سے پرے ذرا سے
پھر تھیلی کا دھیان جو آیا
سب نے اس کو کھولنا چاہا
کھولی جب ہاتھوں سے تھیلی
سونے اور چاندی سے بھری تھی
دیکھ کے اتنا سونا چاندی
آنکھ اُن تینوں کی چندھیائی
رات ہوئی تو ان تینوں کا
بھوک کے مارے حال بُرا تھا
سوچا پہلے کھانا کھا لیں
پھر یہ سونا چاندی بانٹیں
ایک مسافر شہر کو بھیجا
تاکہ واں سے لائے کھانا

باقی دو کے دل پر چھایا
دولت کے لالچ کا سایا
سوچا جب وہ شہر سے آئے
ان کی خاطر کھانا لائے
اُس کو مل کر جان سے ماریں
دولت پھر آپس میں بانٹیں
اُدھر جو شہر گیا تھا تنہا
اُس کو بھی لالچ نے جکڑا
سوچا جو کھانا لے جاؤں
کیوں نہ مَیں اُس میں زہر ملاؤں
زہر ملا یہ کھانا پا کر
مر جائیں گے دونوں کھا کر
پھر تو مَیں ساری دولت کا
مالک ہو جاؤں گا تنہا
کھانے میں پھر زہر ملایا
جلدی جنگل واپس آیا

دونوں نے جب آتے دیکھا
مل کر اُس پر دھاوا بولا
ایک ہی وار میں جان سے مارا
وہ تو اگلے جان سدھارا
باقی دو نے اب یہ سوچا
کیوں نہ وہ پہلے کھائیں کھانا
کھانا جب دونوں نے کھایا
زہر نے اپنا اثر دکھایا
مر گئے تینوں دوست وہ سارے
یوں اپنے انجام کو پہنچے
سچ یہ داناؤں نے کہا ہے
لالچ کا انجام بُرا ہے

جیسے کو تیسا

ایک تھا مرغا ایک تھا کُتا
ان کا یارانہ تھا پکا
اک دن ایک گھنے جنگل سے
دونوں ساتھی گزر رہے تھے
شام ہوئی جب چلتے چلتے
دل میں یہ سوچا دونوں نے
نیند آئی ہے کیسے سوئیں؟
کہاں پہ جاکر رات گزاریں؟
اتنے میں اک پیڑ کو دیکھا
پیڑ بھی تھا وہ بہت پرانا
مرغا پیڑ کے اوپر بیٹھا
کُتے نے بھی تنے کو دیکھا
غار تھی گہری اُس کے اندر
کُتا اس میں بیٹھا جا کر

دونوں ساتھی چین سے سوئے
صبح ہوئی تو اُٹھ کر جاگے
مرغے نے جب پروں کو کھولا
ککڑوں کوں ککڑوں کوں بولا
لومڑی پاس سے گزر رہی تھی
سنی جو یہ آواز تو چونکی
سوچ رہی تھی صبح سویرے
ہاتھ شکار لگا ہے میرے
پیڑ سے جب نیچے آئے گا
بچ کر مرغ کہاں جائے گا؟
مزے مزے سے کھاؤں گی مَیں
مرغا خوب اڑاؤں گی مَیں
مرغے نے بھی جب یہ دیکھا
وہ نہ درخت سے نیچے اترا
لومڑی بولی ''بھائی مرغے!
لگتے ہو تم کتنے اچھے!

کیسی ہے آواز تمہاری!
کیسی ہے پرواز تمہاری!
اُترو بھی اب پیڑ سے نیچے
چاہتی ہوں مَیں ملنا تم سے
مرغا سارا دھوکہ سمجھا
ہنس کر پھر وہ اُس سے بولا
''پیڑ یہ سارا میرا گھر ہے
تنے کے نیچے اس کا در ہے
اس رستے سے اوپر آؤ
ملنا چاہو تو مل جاؤ!''
لومڑی خوش خوش آگے بڑھ کر
جونہی پہنچی غار کے اندر
پھاڑ دیا اُس کو کتے نے
پہنچی وہ انجام کو اپنے
سچ ہے قول یہ داناؤں کا
جیسے کو ملتا ہے تیسا

لالچی کُتّا

اک دن اک آوارہ کُتّا
شہر کے اک بازار سے گزرا
اپنی دُھن میں وہ جاتا تھا
کچھ کھانے کو ڈھونڈ رہا تھا
فرش پہ اک ہڈی کا ٹکڑا
پڑا ہوا جو اس نے دیکھا
جھپٹا اُس پر آگے بڑھ کر
لے کر بھاگا شہر سے باہر
ہڈی کو یوں منہ میں دبائے
جاتا تھا وہ نہر کنارے
ایک جگہ جب رک کر دیکھا
پانی میں تھا عکس اُسی کا

لیکن وہ نادان یہ سمجھا
ہے یہ کوئی دوسرا کُتا
اس کے منہ میں جو ہڈی ہے
میری ہڈی سے وہ بڑی ہے
اُس کے جی میں لالچ آیا
دل ہی دل میں اس نے سوچا
یہ ہڈی گر اس سے چھینوں
پھر تو بیٹھ مزے سے کھاؤں
سوچا تو پہلے غرّایا
منہ کھولا اور اس پر جھپٹا
جونہی اس کے منہ سے چُھوٹی
گر گئی اس کی اپنی ہڈّی
جب یہ نظارہ اس نے دیکھا
رہ گیا کھلا ہوا منہ اُس کا
لالچ کا انجام یہ پایا
کچھ بھی اُس کے ہاتھ نہ آیا

انگور کھٹے ہیں

ایک تھا جنگل ہرا بھرا سا
شیر تھا اس جنگل کا راجا
ریچھ، ہرن، گیدڑ اور ہاتھی
سب کے سب تھے شیر کے ساتھی
لومڑی، زرّافہ اور چیتے
سارے جنگل میں رہتے تھے
گھنے گھنے سب پیڑ تھے اس میں
ہرے بھرے سب پیڑ تھے اس میں
اک دن زرّافے نے آ کر
لمبی سی گردن کو اُٹھا کر
لومڑی کو ایسے بتلایا
''میری پیاری لومڑی آپا

مَیں نے جنگل کے کونے میں
دیکھی ہیں انگور کی بیلیں
آہا! کیا ان کی خوشبو تھی!
خوشبو کیا گویا جادو تھی
انگوروں کا رنگ تھا پیارا
ہَرا ہَرا اور ذرا سنہرا
سارے تھے انگور وہ پکّے
مزے مزے کے میٹھے میٹھے
تم بھی جا کر ان کو دیکھو!
ممکن ہو تو ان کو چاکھو!''
سُن کر زرّافے کی زبانی
انگوروں کی نئی کہانی
لومڑی کا بھی جی للچایا
اُس کے منہ میں پانی آیا
کہتی تھی وہ جی میں اپنے
''مل جائیں انگور جو سارے

اک اک کر کے خود کھاؤں گی
سب کے جی کو ترساؤں گی''
یہ سوچا تو دوڑی دوڑی
انگوروں کی بیل پہ پہنچی
دیکھا تو وہ بیل تھی اونچی
اس کے قد سے کہیں بڑی تھی
سوچا کیسے اوپر جاؤں؟
جا کر انگوروں کو پکڑوں
اُچھلی، پھر وہ نیچے آئی
نیچے گِر کر پھر وہ اُچھلی
اُچھل اُچھل کر جب تھک ہاری
کیا کرتی آخر بے چاری
ہاتھ انگور نہ آئے اُس کے
یہی نصیب تھے ہائے اُس کے
کہنے لگی وہ عاجز آ کر
''واپس ہی جاتی ہوں اب گھر

کون یہ کہتا ہے پکے ہیں
مزے مزے کے اور میٹھے ہیں
میرے ہاتھ نہیں جو آئے
یہ سارے انگور ہیں کھٹے''

غرور کا سر نیچا

ایک گھنے جنگل میں تنہا
رہتا تھا اک بارہ سِنگھا
اِدھر اُدھر تھا گھومتا رہتا
گھومتا رہتا، پھرتا رہتا
اک دن گرمی کے موسم میں
دھوپ کی شدت کے عالم میں
پیاس ہوئی محسوس جو اُس کو
دیئے دکھائی ایک کے دو دو
نظروں میں چھایا تھا اندھیارا
ہوئی زبان بھی سُوکھ کے کانٹا
آخر پانی ڈھونڈنے نکلا
سارا جنگل اُس نے چھانا

ایک طرف جب اُس نے دیکھا
پانی کا چشمہ بہتا تھا
بھاگا وہ چشمے کی جانب
دھوپ سے اک سائے کی جانب
چوکڑی بھرتا دور گیا وہ
اُس چشمے پر جا پہنچا وہ
چشمے کا تھا ٹھنڈا پانی
تازہ تازہ میٹھا پانی
ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی کر
پیاس بجھائی یوں چشمے پر
اب جو غور سے اُس نے دیکھا
پانی تھا آئینے جیسا
پانی میں جو دیکھا اُس نے
اپنے عکس کو دیکھا اُس نے
سینگ نظر جب آئے بارہ
کتنا دلکش تھا نظارہ

اپنا آپ غرور سے دیکھا
دل ہی دل میں اُس نے سوچا
''میرے سینگ ہیں کتنے پیارے
خوب چمکتے اور نوکیلے
جیسے ہوں اک پیڑ کی شاخیں
لمبی لمبی پتلی شاخیں
سر پر جیسے تاج ہے میرا
جنگل بھر میں راج ہے میرا
ان سینگوں کا کیا ہے کہنا
یہ ہیں میرے سر کا گہنا''
ابھی یہ باتیں سوچ رہا تھا
اتنے میں کیا اُس نے دیکھا
اُس جانب اک شیر تھا آتا
غصے میں تھا وہ غرّاتا
شیر ببر جب آتے دیکھا
بھول گیا وہ سارا نشہ

بارہ سنگھا خواب سے جاگا
چشمہ چھوڑ کے سرپٹ بھاگا
بھاگا تیز وہ جب جلدی میں
پھنس گئے سینگ کسی جھاڑی میں
شیر بھی اتنے میں آ پہنچا
آتے ہی وہ اُس پر جھپٹا
خوب شکار کو چیرا پھاڑا
مزے سے شیر نے اُس کو کھایا
جن سینگوں پر ناز تھا اُس کو
وہی مصیبت بن گئے دیکھو!
داناؤں نے سچ یہ کہا ہے
سدا غرور کا سر نیچا ہے

خرگوش اور کچھوا

اک دن اک خرگوش تھا جاتا
راہ میں اس نے کچھوا دیکھا
ہَولے ہَولے قدم اٹھاتا
کچھوا سُست چلا جاتا تھا
دیکھی جب یہ چال تو اُس پر
ہنسنے لگا خرگوش اُچھل کر
جانوروں میں تو ہے کیا شے؟
دیکھ کے تجھ کو گھِن آتی ہے
صورت کیا بیزار ہے تیری
سُست بہت رفتار ہے تیری
کون ہے تو؟ کیا نام ہے تیرا؟
سُستی نے کیوں تجھ کو گھیرا؟

سُن کر اس کی بات کو کچھوا
نرمی اور ادب سے بولا
''کچھوا میرا نام ہے بھائی!
مَیں بھی ہوں مخلوق خدا کی''
بات سُنی جب یہ کچھوے کی
ہنسی بہت خرگوش کو آئی
یہ دیکھا تو کچھوا بولا
''ہنستے ہو کیوں مجھ پر بھیّا؟''
بولا پھر خرگوش ''او کچھوے!
تو میرا بھائی ہے کیسے!
تیری چال ہے دھیمی دھیمی
میری چال ہَوا کی تیزی''
کچھوا بولا ''دوڑ لگائیں
اپنی اپنی چال دکھائیں
اگلے گاؤں میں جو ندی ہے
اپنی دوڑ کی منزل بھی ہے''

بولا یہ خرگوش اُچھل کر
''مجھ کو ہے منظور سراسر''
دونوں نے پھر دوڑ لگائی
آگے تھی اک گہری کھائی
کچھوا آہستہ چلتا تھا
اور خرگوش تو دوڑ رہا تھا
پیڑ تھا اک کھائی کے آگے
اس کی گھنی چھاؤں کے نیچے
پہنچا تو خرگوش نے سوچا
ابھی تو دور ہی ہوگا کچھوا
کیوں نہ یہاں آرام کروں مَیں
اٹھ کر باقی کام کروں مَیں
سو گیا پھر خرگوش مزے سے
لیتا تھا گہرے خراٹے
شام کو پھر خرگوش جو جاگا
پوری طاقت سے وہ بھاگا

ندی پر پہنچا تو دیکھا
پہلے سے کچھوا تھا پہنچا
چلتے چلتے رفتہ رفتہ
دوڑ یہ کچھوا جیت چکا تھا

❁

چار چُوزے

اک بستی میں چار تھے چُوزے
چاروں مل جل کر رہتے تھے
اک دن سیر کی خاطر سارے
چوزے اپنے گھر سے نکلے
اک چوزہ تھا بہت نکما
سُستی اور غفلت کا مارا
چلتے چلتے رہ گیا پیچھے
باقی تھے اب تین ہی چوزے
تینوں کو اب جوش جو آیا
لگے سنانے چوں چوں گانا
گاتے گاتے سانس جو پُھولی
اک کو زور کی آئی ہچکی

وہ چوزہ بھی رہ گیا پیچھے
اب تو رہ گئے دو ہی چوزے
دونوں چوزے خوف کے مارے
تھر تھر تھر تھر کانپ رہے تھے
کہتے تھے وہ اک دوجے کو
بھیّا! اب تو گھر کو بھاگو
اک چوزہ تھا ان میں ایسا
نافرمان اور ضد کا پکّا
اُس نے اُس کی بات نہ مانی
رہ گیا اب تو ایک ہی باقی
وہ چوزہ تھا ایک اکیلا
کیا ہو گا؟ یہ سوچ رہا تھا
اتنے میں اک آ گئی بلّی
اس کو فوراً کھا گئی بلّی
یہ انجام ہوا چوزوں کا
کام تمام ہوا چوزوں کا

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

اسلم، اکرم دوست تھے دونوں
دوست بھی تھے وہ گہرے دونوں
ایک ہی شہر کے باسی تھے وہ
دکھ اور سکھ کے ساتھی تھے وہ
اک دوجے کے یار بہت تھے
آپس میں غم خوار بہت تھے
دونوں میں اُلفت تھی ایسی
سچی اُلفت بھائیوں جیسی
دوست تھے دونوں دولت والے
عزت والے، شہرت والے
اک دن اسلم نے یہ سوچا
”کیوں نہ سفر کروں مَیں حج کا؟
حج ہے ایک عظیم عبادت
مل جائے گی مجھے سعادت“

یہ سوچا تو کی تیاری
حج کے دور دراز سفر کی
پھر اپنا سب سونا لے کر
آیا وہ اکرم کے گھر پر
اُس سے لگا یہ کہنے اسلم
''پیارے دوست محمد اکرم!
میری ساری دولت رکھو
اپنے پاس امانت رکھو
مجھے ہے جانا دور سفر پر
لے لوں گا مَیں واپس آ کر''
حج کے بعد جو اسلم آیا
اکرم کو کچھ بدلا پایا
واپس جب مانگا وہ سونا
اکرم نے یہ رویا رونا
اس کے دل میں کھوٹ جو آیا
بولا ''دکھ کی بات ہے بھیا!

کھا گئے سارا سونا چوہے
ریزہ ریزہ کتر کتر کے''
اسلم تھا خاموش یہ سُن کر
سمجھا کھوٹ ہے دل کے اندر
کچھ دن بعد یہ اس نے سوچا
کیسے لوں مَیں اس کا بدلہ؟
اک دن اکرم کے سب گھر کی
اس نے اک دعوت کر ڈالی
اسلم کے گھر کھانے آئے
اکرم اور اس کے سب بچے
اسلم نے موقع پایا جو
اکرم کے چھوٹے بچے کو
دور چھپایا اک کمرے میں
اپنے گھر کے اک کونے میں
اکرم نے جب ڈھونڈا بچہ
کہیں نہ پایا اپنا بچہ

''کہاں ہے؟'' جب پوچھا اسلم سے
سوچا اور لگا وہ کہنے
''لے گئی چیل اڑا کر اُس کو
چونچ میں خوب دبا کر اُس کو''
اکرم بولا ''کیا کہتے ہو؟
کیا یہ ممکن ہے، ایسے ہو؟''
اسلم بولا ''ٹھیک ہے بھائی!
ہو سکتی ہے ہر انہونی
چوہے کھا سکتے ہیں سونا
چیل اڑا سکتی ہے بچّہ''
سنی جو سچّی بات اسلم کی
رنگت بدلی اب اکرم کی
یاد آئی اپنی نادانی
شرم سے تھا وہ پانی پانی
سچ یہ کہا ہے داناؤں نے
جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

لالچ بُری بلا ہے

اک دلچسپ کہانی سن لو
بہت دنوں کی بات ہے بچو!
اک بڑھیا تھی گاؤں میں رہتی
تھی وہ بہت غریب بچاری
کچا خستہ گھر تھا اُس کا
ٹوٹا پھوٹا در تھا اس کا
اک دن زور سے بادل گرجا
بجلی چمکی اور مینہ برسا
اس نے دیکھا کُٹ کُٹ کرتی
اس کے سامنے تھی اک مرغی
بارش میں وہ بھیگ چکی تھی
تھر تھر تھر تھر کانپ رہی تھی
کُٹ کُٹ کُٹ کُٹ کُٹ کُٹ کرتی
بڑھیا سے یوں مرغی بولی

''اس موسم میں مجھے پناہ دو
تھوڑی اپنے پاس جگہ دو''
بڑھیا بولی ''پناہ نہیں ہے
گھر میں میرے جگہ نہیں ہے''
مرغی بولی ''رہنے دو گر
ہے یہ تمہارے حق میں بہتر''
بڑھیا بولی ''میرا گھر ہے
مجھے پتہ ہے کیا بہتر ہے
گر مَیں تم کو رہنے دوں گی
اپنے ہاتھوں آپ مروں گی
مَیں تو خود بھوکی رہتی ہوں
غربت کے صدمے سہتی ہوں
مجھ سے کیسے ہو گا پورا
روز تمہارا دانا دُنکا''
مرغی بولی ''کچھ مت سوچو
خوف خدا کا مجھ پر کھاؤ
رحم کرو کچھ رحم کرو تم
مجھ کو گھر میں رہنے دو تم
دانا دُنکا بھی پا لوں گی
جو کچھ مل جائے کھا لوں گی''
بڑھیا نے جو رحم دکھایا
قدرت نے پھر پلٹی کایا
مرغی نے جب دیا اک انڈا
انڈا نکلا وہ سونے کا
روز جو انڈا دیتی تھی وہ
سونے ہی کا دیتی تھی وہ
اب تو بڑھیا کے دن بدلے
اس کے پاس بھی آئے پیسے
اس کا گھر اب ہو گیا پکا
لوگ تھے دیکھ کے ہکا بکا
لیکن جوں جوں آیا پیسا
اس کے دل میں لالچ آیا

ہر دم سوچ میں رہتی تھی وہ
اپنے جی میں کہتی تھی وہ
مرغی کے ہیں پیٹ میں جتنے
انڈے ہیں سارے سونے کے
گر سارے انڈے مل جائیں
دل کے سب غنچے کِھل جائیں
گر یہ سارا سونا لے لوں
مَیں بھی پھر دولت میں کھیلوں
دولت اپنے پاس رکھوں مَیں
پھر تو بڑی رئیس بنوں مَیں
یہ سوچا تو چھری اٹھائی
مرغی کے پھر پاس وہ آئی
مرغی نے جب لالچ دیکھا
بڑھیا کو اس نے سمجھایا
بولی ''مت مارو تم مجھ کو
صبر اور شکر سے عمر گزارو

روز جو دیتی ہوں مَیں انڈا
کیا یہ کافی نہیں ہے سونا؟''
لیکن بڑھیا کچھ مت بولی
لالچ میں وہ ہو گئی اندھی
اس نے فوراً پکڑی مرغی
گلے پہ اس کے چھری چلائی
جلدی سے پھر پیٹ کو چیرا
نظر نہ آیا ایک بھی انڈا
اب تو اس کا حال بُرا تھا
آنکھوں میں تھا گھور اندھیرا
ہر دم اس کا غم کھاتی تھی
روتی تھی اور چلاتی تھی
ہوئے نہ اُس کے ارماں پورے
رہ گئے سارے خواب ادھورے
سچ ہی بزرگوں نے یہ کہا ہے
بچّو! لالچ بُری بلا ہے

گیت

ہم کلیاں ہم پھول
جائیں سب اسکول
علم ہے کرنوں کا اک دھارا
مٹے جہالت کا اندھیارا
چاند بنے ہر دھول
ہم کلیاں ہم پھول
روشنیوں پر حق ہے اپنا
دیکھیں ایسے دن کا سپنا
رات کو جائیں بھول
ہم کلیاں ہم پھول
پھیلے یوں تعلیم کی خوشبو
مہک اٹھے یہ دنیا ہر سو
بنے یہی معمول
ہم کلیاں ہم پھول

ہر پھول ہو مہکا ہوا
ہر چاند ہو چمکا ہوا
یہ حق ہے ہر انسان کا
ہر روح کا ہر جان کا
صحت کی دولت چاہیئے
یہ ہے خزانہ بے بہا
ہر پھول ہے مہکا ہوا
شفاف پانی پینے کو
خالص غذا ہو جینے کو
اور سانس لینے کے لیے
سب کو ملے تازہ ہوا
ہر پھول ہو مہکا ہوا
کھانسی ہو یا اسہال ہو
خسرہ ہو یا ہو پولیو
ان سے بچاؤ کے لیے
سب کو ملے اچھی دوا
ہر پھول ہو مہکا ہوا

ترتیب

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵
	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱	۲۲
	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸	۲۹
	۳۰	۳۱	۳۲				
۳۳	۳۴	۳۵	۳۶	۳۷	۳۸	۳۹	۴۰
۴۱	۴۲	۴۳	۴۴	۴۵	۴۶	۴۷	۴۸
۴۹	۵۰	۵۱	۵۲	۵۳	۵۴	۵۵	۵۶
۵۷	۵۸	۵۹	۶۰	۶۱	۶۲	۶۳	۶۴
۶۵	۶۶	۶۷	۶۸	۶۹	۷۰	۷۱	۷۲
۷۳	۷۴	۷۵	۷۶	۷۷	۷۸	۷۹	۸۰